نئی شاعری کی تحریک اور اس کے اہم علمبردار

نسیم عباس احمر *

Abstract:

This research article reflect the contribution of a modern literary movement namely movement of new poetry. It had been discussed in the article that in 1960, the writing literary living in Pakistan felt that the old paradigm style, techniques and their topics as well have been out dated.

So they started to express their poets in the form of symbolism that main poets who contributed in this movement are Iftikhar Jalib, Anis Nagi, Abdul Rashid, Zahid Dar and Tabsum Kashmiri.

ادب میں روایت اور جدیدیت کی اساس اس عہد کی فکری، جذباتی اور لسانی ژولیدگی ہوتی ہے کیوں کہ روایت کی ONTOLOGY کا تعلق سراسر اس بات سے ہے کہ آج کی جدیدیت، کل روایت کا حصہ بن جائے گی اور کل کی جدیدیت، آج کی روایت سے منسلک ہے۔ یوں روایت، جدیدیت، نئے اور پرانے کی بحثیں محض کسی عہد کے ادب کی درجہ بندی نہیں ہیں بلکہ اسی کی حد بندی اس جدلیاتی عمل میں مضمر ہے کہ ہر اس گزرے عہد کا ادب اس وقت تک پرانا کہلا تا رہے گا جب تک وہ نئے عہد سے کسی نہ کسی طور وابستہ نہ ہو، اس کی ماہیت اور قطعیت اس عہد کا ساتھ نہ دے۔ یوں یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ پرانے اور نئے کی تخفیص کی نوعیت اور بنیاد کو تلاش کیا جائے کہ نئے ادب کا شعور کن بنیادوں پر استوار ہے اور کن امکانات کا جواز فراہم کرتا ہے۔ تغیر کے عمل میں انفرادیت اپنے مدارج کے ہمراہ جلوہ گر ہوتی ہے اس انفرادیت میں تازگی کا عنصر بھی نمایاں ہونا چاہیے تاکہ کہیں یہ انفرادیت اپنی مانویت نہ کھو جائے۔ شعر و ادب میں یہ صورت حال نت نئے تجربات کی متقاضی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں:

> ''درحقیقت جدید شاعری وہ ہے جو کسی انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے اس لئے روایت سے تھوڑی سی بغاوت ضروری ہے۔ تجربے کے ہاتھ کا بھی اس میں شامل ہونا یقینی ہے۔ جو

* استاد شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

شاعری کی بنی بنائی ڈگر سے تھوڑا ہٹ کر چلتی ہے اور جس کی رفتار میں تجربے کا
آہنگ ہوتا ہے۔ان کوادبی اصطلاح میں ''جدید'' کہتے ہیں۔''

یہاں میرا مقصد نئی شاعری ہے جس کا آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا۔نئی شاعری کا یہ رجحان اس دور کے تخلیقی لوگوں کے گروہ کا نتیجہ ہے جو مروجہ زبان سے انحراف کے خواہاں تھے۔وہ نئے لسانی اسلوب اور پیٹرن کی تلاش میں کوشاں تھے۔وہ الفاظ کو مختلف النوع اور Multidimentional, روپ دینے کی اس سعی میں تھے جن سے نیا تنقیدی لحن جنم لے۔یہ شعری تناظر اردو نظم میں ہیتی رجحانات اور تکنیکی تجربات کے ایک نئے وصف کو ابھارتا ہے۔ اردو نظم کا یہ رجحان لسانی شعور کی تہ داریوں سے مکمل طور پر آشنائی کی صورت اپنی بھرپور گہری رمز اور معنویت سے ظاہر ہوا۔نئی شاعری کے اہم نظم نگاروں میں افتخار جالب' جیلانی کامران، عباس اطہر، انیس ناگی، تبسم کاشمیری اور سلیم الرحمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔مجموعی طور پر یہ شعرا جدید اردو نظم سے تعلق رکھتے ہیں۔مگر ان کا شعری زبان کے ایک منظّم استعاراتی، علامتی اور امیجری آہنگ کو وجود میں لانا تھا۔نئی نظم کے بیشتر شعراء اپنی فکریات اور محسوسات کے زرخیز شعور کو وجود' زیست' اور سماج کے معروضی تناظر میں ابہام اور اظہار کے پُل کے سہارے بیان کرتے ہیں۔جو معاصر ادبی منظر نامے میں نئی فکری' لسانی' جذباتی' اور سماجی فضا سے معمور ہے۔اسی وساطت سے وہ وجودیت' تہذیبی تصادم' جدلیاتی متخیلہ' تعقلاتی مجادلہ، تاریخی وسیاسی شعور' سماجی عدم اطیمنانی، ذات کی منہائیت، انسانی شعور کے تضادات وتنازعات، غیر مربوط ناموس جذبات اور خیالات وتعلقات کو جدید طرزِ احساس سے ہم آمیز کرتے ہیں۔ان کے شعور کی تشکیل وترتیب فکر وخیال' زبان و بیان' انفرادی واجتماعی رجحانات' متحرک فکری شاخسانہ، جبر وآزادی کے ردعوامل اور اپنے سامنے سے ناآسودگی اور فکری تحرک وجبلت سے ہوتی ہے۔

سائنس کی نئی دریافتوں اور صنعتی ترقی نے انسانی تہذیب وتمدن کی اقدار کو پامال کیا ہے۔تجارتی دنیا کی وسعت' اجتماعی سماجی انتشار اور پیداواری نظام کے تضادات نے انسان کے تخلیقی پہلوؤں کو چھین لیا ہے۔انسان اپنی داخلی تنگ دستیوں اور خارجی کربناکیوں کے باعث، اجنبیت اور بیگانگی کا شکار ہے۔وہ نجی مفادات، ذاتی تصنع و آرائش کی خاطر خودغرضی اور بے حسی کی لپیٹ میں ہے۔کافکا کی ''میٹامافورس'' البیر کامیو کی ''سٹرینجز'' اور ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی ''ویسٹ لینڈ'' اسی پس منظر کا حصہ ہیں۔اور اردو ادب میں افتخار جالب کی طویل نظم ''قدیم بنجر'' بھی اسی تسلسل میں ہے۔

عقیل احمد صدیقی کے بقول

''جدید شعری جمالیات (جس کی تربیت میں افتخار جالب اور شمس الرحمٰن فاروقی نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے؟ جس اصول کو مرکزی حیثیت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعری میں تجربے یا محسوسات کا اظہار ہوتا ہے لیکن ''شعریت'' کا پیمانہ موضوع یا تجربہ نہیں بلکہ ''فارم'' ہے۔ اور ''فارم'' جو کچھ ہے وہ الفاظ کی تنظیم سے عبارت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری زبان کی مخصوص تنظیم کا نام ہے اور تنظیم کا عمل کسی بھی صورت لاشعوری نہیں ہوتا۔ یعنی ''شعریت'' کوئی ایسا لاشعوری عمل نہیں ہے جسے شاعر خواب یا جنوں کی حالت میں یا غیر ارادی طور پر حاصل کرتا ہے بلکہ ''شعریت'' ایک شعوری اور ارادی عمل ہے۔ جسے فن کار محنت اور تنقیدی سوجھ بوجھ کے استعمال سے حاصل کرسکتا ہے۔ یہ تصور جہاں اس مفروضے کا انکار ہے کہ شاعری بے ساختہ اظہار کا نام ہے یا شاعری کی تخلیق محض جنوں یا نشے کی حالت میں انجام پاتی ہے۔ وہیں قدیم کلاسیکی رجحان کی بازیافت بھی ہے جس کے بارے میں عام خیال یہ رہا ہے کہ کلاسیکی ادیب شاعری کو ''صناعت'' سمجھتے رہے ہیں''

نئی شاعری کے نمائندہ شاعروں کی تخلیقات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نیا شاعر اپنی ذات، وجود اور سماج کے بطن سے جنم لینے والے مسائل کو بیان کرتا ہے۔ نیا شاعر اپنے متخیلہ کی بناء پر انفرادی اور اجتماعی صورت حال کو نئے شعری مفاہیم دیتا ہے اور معانی کی نئی دنیا تشکیل دیتا ہے۔ یہ نئے تجربات، الفاظ کو استعارہ، علامت اور امیجز کا روپ دیتے ہیں۔ وہ روایتی طرز اظہار کے بجائے جدید طرزِ احساس کے اظہار کے لئے نئے سانچے بناتا ہے۔ وہ الفاظ میں سادگی کے بجائے علامت، استعارہ اور امیج کا سہارا لیتا ہے۔ وہ نت نئے تخلیقی انواع وجود میں لاتا ہے۔ وہ شاعرانہ حقیقتوں کو انفرادی اور معروضی تلازمے کے ذریعے بیان کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ نیا شاعر نظامِ ذلیت میں میکا نکیت کے تصور کو اپنی تخلیقی نہج سے دور کرنے کی بھرپور سعی کرتا ہے۔ وہ اپنی تمناؤں، خواہشوں اور عقائد کی موت کا سرعام اعلان کرتا ہے۔ اور موت کی دہشت کو وحشت سے ان پر غور وفکر کرتا ہے کہ سماجی عدم توازن پن کو شعور کی آگہی سے کیسے ہمکنار کیا جائے؟ کیوں کر کیا جائے؟ اس کے لئے کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ وہ ان سب سوالوں کے جواب میں نئے معانی کی تشکیل سے تیسری دنیا کے انسان کے عدم توازن پن اور عدم تیقن میں اک نئی تحریک پیدا کرتا

ہے تا کہ زندگی کی لامعنویت نئے اسلوب زیست کو قبول کر سکے۔ یہ سب باتیں نئی شاعری کے منصوبے کی بنیاد ٹھہریں۔

افتخار جالب ''ماخذ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''میں چیزوں کو اس انتشار اور پھیلاؤ کے بغیر قبول نہیں کر سکتا جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے جدو جہد کرتا رہوں گا۔ چیزیں متغیر ہوتی نظر آتی ہیں تو آئیں ترتیب گم ہوتی ہے تو ہو جائے۔ رشتے درہم برہم ہوتے ہیں تو کیا ہوا۔ اسی الٹ پلٹ، انتشار پیچیدگی اور پھیلاؤ میں میری روحانی آبرو ہے۔''

جدید عہد کے صنعتی معاشرے میں جیسے زندگی کے اطوار بدلے ہیں بعینہ ہی شعرہ ادب میں سوچنے کا انداز بہر طور متاثر ہوا ہے۔ اس تناظر میں نئے شاعر کے طرزِ فکر بدلنے سے طرز اسلوب بھی بدلا ہے۔ اس صورتِ حال کا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بخوبی تجزیہ کیا ہے۔

> ''حال ہی میں بعض نئے شاعروں نے اردو کا رشتہ ایک بار پھر ادب کے عالمی رجحانات سے جوڑ دیا ہے۔ ان میں سے وہ رجحانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو جدید دور کے ثقافتی انتشار، آدرش کے فقدان اور انسان کے بے چہرہ ہونے کے تصور سے پیدا ہوئے ہیں۔ انکے زیر اثر جو نئی شاعری لکھی جارہی ہے' وہ نئی نسل کے اس انسان کی آواز ہے جس کے پاس نہ اقدار کا سرمایہ ہے نہ آدرش کا آئینہ اور جس کا وجود خود اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ یہ ہر طرح کی دقیانوسیت اور روایت کے خلاف ہے۔ اسے ایک ایسا باغی کہا گیا ہے جس کا کوئی آئیڈیل نہیں۔۔۔ نئے اثرات کے تحت لکھی جانے والی شاعری مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے پچھلی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ پرانی ادبی اصطلاحوں اور ترکیبوں کی مدد سے اسے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے ۔مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت سے انحراف کی شاعری ہے یا یہ باغیانہ شاعری ہے یا یہ کہ اس میں ایک ماتمی لے ملتی ہے تو یہ اس شاعری سے

انصاف نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پرانے تنقیدی لیبل اس پر ٹھیک نہیں بیٹھتے کیوں کہ یہ نہ مقصدیت کی شاعری ہے، نری ہیت کی، یہ نہ داخلیت کی آواز ہے نہ خارجیت کی۔ غم دوراں اور غم جاناں کی تقسیم بھی یہاں بے کار نظر آتی ہے۔ یہ فرار یا اقرار کی شاعری بھی نہیں۔ یہ انسان کو اس کے وجودی روپ میں دیکھنے کی جستجو ہے یا غم اور مسرت کو غم اور مسرت سمجھنے کی کوشش'' [۴]

نئی شاعری کے مذکورہ بالا بنیادی جواز کی ایک جھلک ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ہاں بھی ملتی ہے۔

''نئی شاعری نئے شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شعور ہیت اور مواد دونوں کے نئے نظام سے متعلق ہے۔ یہ مواد خارجی زندگی کے اس نئے ڈھانچے سے حاصل ہوتا ہے کہ جس کی بنیادیں سائنسی نقطہ نظر اور صنعتی تہذیب پر استوار ہو رہی ہیں۔ صنعتی تہذیب کا ڈھانچہ اپنی شکل کی مکمل وضاحت نہیں کر سکا ہے، اس لیے نئی شاعری ایک غیر سالم تہذیب سے پیدا ہوا رہی ہے۔ یہ غیر سالم تہذیب اور اس کا آشوب آج کے شاعر کی جذباتی اور تخلیقی زندگی کا سرچشمہ ہے اور اس سے آج کی شاعری کے مسائل جنم لے رہے ہیں'' [۵]

نئی شاعری قطعاً روایت کا انکار نہیں بلکہ یہ روایت میں ترامیم اور اجتہاد کی قائل ہے۔ اس تغیر کا مظہر تصوراتی بنیادیں ہیں۔ نئی شاعری کے لسانی اسلوب کی بنیاد محض زبان کی توڑ پھوڑ نہیں بلکہ تہذیبی زوال کی علامت ہے۔ جس میں زبان کے تجربات، انسانی تہذیب کے نئے رویوں اور انکشافات کی شناخت ہے۔ یہ انکشافات عہد حاضر کے انسانی تضادات اور تہذیبی تصادم سے جنم لیتے ہیں۔

بقول شمیم حنفی

''روایت کی نفی کا مسئلہ نئی جمالیات کے باب میں اس وقت سامنے آتا ہے جہاں معاصر عہد کی یکسانیت' بے رنگ' تشدد اور دہشت کی فضا اپنے انعکاس کے لئے اظہار کے ایسے سانچوں کی تلاش پر اکساتی ہے جو اس ابتری اور بدنظمی یا اکتاہٹ کے احساس کو لسانی دقتوں کی شکست کے ذریعے واضح کر سکیں۔ اس وقت سلیس اور رواں دواں' ترشی ہوئی اور سڈول زبان نیز آراستہ اور خوب

صورت صغیر اظہار کی جگہ ایک ایسا کھردرا، غیر متوقع جارحانہ اور متشدد اسلوب جنم لیتا ہے جس کی صوتی اور لسانی ترکیب میں پرانے وقتوں کی آسودہ خاطری‘ غنائیت اور توازن، تناسب کے بجائے نئی تہذیب کے شعور شرابے، خوف اور داخلی انتشار کی گونج شامل ہوتی ہے۔ یہ اسلوب نئے انسان کے ذوق جمال کے مسلسل انحطاط، اس کی پریشان نظری اور فکری اعتبار سے اس کے بے سرو سامانی کا اشاریہ ہے۔‘‘ [۴]

نئی شاعری کی لسانی اساس کو مندجہ ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ نئی شاعری کی لسانی اساس تجربے پر ہے۔ نیا شاعر اپنے فکر اور تخیل کی آویزش سے اپنے آپ کو، اپنے سماج، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت کو انفرادی تجربے کی صورت بیان کرتا ہے۔

۲۔ نیا شاعر آفاقی اقدار اور احساس کی ہمیشگی کے اظہار کے لئے استعارہ‘ علامت‘ امیج تخلیق کرتا ہے۔ وہ جذبات اور تجربات کو الفاظ کے ذریعے بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ سیدھے سادھے الفاظ جو استعارہ‘ علامت اور امیج کا روپ اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ دنیا کی غلامی سے آزاد ہو کر ہر فرد کے ذہنوں میں اتر جاتے ہیں اور ہمارے باطن کا‘ زمین‘ کائنات‘ اور فطرت سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔ نئی شاعری میں نئی علامتوں، نئے استعاروں اور نئے امیجز کی تخلیق کے جواز پر انیس ناگی کا نقطۂ نظر ملاحظہ کیجئے۔

’’زبان ایک علامتی عمل ہے جس کی تشکیل اشیاء کی نام دہی کی بدولت ہوتی ہے جوں کہ ہر لفظ بذاتِ خود ایک شے یا تجربہ ہے اس لیے فن کار الفاظ کی جکسٹا پوزیشن سے معانی کا اسلوب مرتب کرتا ہے فن کار تخلیق کے لیے احساساتی علامتیں مخترع کرتا ہے اور چوں کہ یہ علامتیں احساساتی ہوتی ہیں اس لئے ان کا منطقی پیرا فریز نہیں کیا جا سکتا۔‘‘

۳۔ نیا شاعر معاصر بین الاقوامی ادب پر کڑی نظر رکھتا ہے تا کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں تخلیق کیے جانے والے ادب کے تناظر میں اردو ادب کا مقام پرکھا جائے پھر ان ضابطوں کے مطابق اردو شاعری کی لسانی، فکری، فنی اور اسلوبیاتی سطح کو از سرِ نو تشکیل دیا جائے۔

۴۔ نیا شاعر کلاسیکی ادب پر بھی عبور رکھتا ہے تا کہ وہ روایت سے بغاوت نہ کرے اور نہ ہی قاری یا نقاد نئی شاعری

کے مطالعے میں روایت کو لہذا سمجھے۔ کلاسیکی ادب پر گرفت سے اسے نئے لسانی رشتوں کی دریافت میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کہ تاریخ میں ردوقبول اور تعمیر و تخریب کی کیا صورت حال ہے۔

۵۔ نیا شاعر نہ تو روایت کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور نہ ہی اپنے لسانی مزاج کو۔ بلکہ وہ اپنے تخلیق کردہ ادب میں نئے خدوخال، موضوع اور نئے اسلوب کے باہمی اشتراک سے ادب کا نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔

۶۔ نیا شاعر اپنے تہذیبی تشخص کے لیے دوسری تہذیبوں کے زوال و عروج کے حوالوں سے گریز نہیں کرتا۔ وہ اپنی تہذیبی شناخت، ایک انفرادی احساس کے بجائے زندگی کی تہذیب کے تجربے سے کرتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ اس لسانی تشکیل سے کہیں ابلاغ کا مسئلہ، قاری اور مصنف کے درمیان جنم نہ لے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ قاری کی تربیت بھی تخلیق کار ہی کرتا ہے۔ یقیناً کوئی تخلیق کار اپنی شعوری یا ذاتی تشفی کے لیے تو محض ادب یا فن پارے تخلیق نہیں کرتا بلکہ قاری کے ذہنی انتشار کی تشفی، تسلی اور تسکین، تخلیق کار کے منفرد اسلوب اور زبان بازی کے عمل سے ہی ہوتی ہے۔ لوئیس بورخیس یوں لکھتے ہیں۔

''نظم اور تفہیم کے درمیان تضادات، تفہیم کا مسئلہ ہے۔ نظم کا نہیں۔ اگر میں اپنی دیانت دارانہ کوشش کے باوجود ایسی تفہیم نہیں کر پاتا جو پورا ''فٹ'' بیٹھے تو میں بڑی سادگی سے کہہ سکتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔ ''میں اس نکتے تک تو پہنچ گیا ہوں لیکن اب اس سے آگے نہیں جا سکتا''۔۔۔۔۔۔ شاعرانہ غلطی کا تصور کوئی عام تصور نہیں ہے اور ایک اچھا نقاد شاذونادر ہی شاعر کو اس غلطی کا قصوروار ٹھہرا کر مطمئن ہوگا۔ اس کے برعکس وہ اس غلطی کو ''واضح'' کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکنہ طور پر ایک دوسرے قانون کے ذریعے جو خود نظم سے باہر موجود ہوگا۔ مثلاً جیسا کہ ارتقاء عالم کی تاریخی کا یقین کرنا پسند کریں گے کہ ہم انڈے کے چمٹے ہوئے چھلکوں کو پہچانتے ہیں جو آخری صورت تک چمٹے رہتے ہیں۔ اگر ہم نظم کا ابتدائی رنگ نہیں جانتے تو ہم شاعر کے لئے ایک ''ارتقاء'' کو تعمیر کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے ہم نظم کے بارے میں اس بنیاد پر قیاس آرائی کرتے ہیں کہ اسے تخلیق کرتے وقت شاعر کے ذہن میں کیا تجربہ یا خیال کارفرما تھا۔

زبان کا غیر روایتی استعمال اور شاعری کا بندھے ٹکے موضوعات سے گریز جدیدیت سے عبارت تو ہیں لیکن جدیدیت کے فکری شاخسانہ میں زندگی کی حرکت، زندگی کی تبدیلی، سماج، فرد اور کائنات کے تسلسل کا عمل دخل بھی ہے۔ تضادات سے بھرپور یہ زندگی، نئے شاعر کے لیے اپنے اجتماعی شعور کی بازیافت ہے۔ نیا شاعر سماجی رشتوں کو بہت اہم گردانتا ہے اور وہ سماج اور فرد کی ہم آہنگی کو لفظ و معانی سے ہم آہنگی کے ساتھ بہت ضروری سمجھتا ہے۔ نیا

شاعر اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کو سماجی عمل سے پیوستہ کر کے جو شعری وژن مہیا کرتا ہے وہ فکر و خیال اور لفظ و معانی کی نئی دنیاؤں کے منظّم ہونے میں مخفی ہے۔نئی شاعری اور جدیدیت کا آپس میں کس قدر تعلق ہے؟ نئی شاعری جدیدیت کی اک نئی لہر ہے۔ جو ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے۔ جدیدیت کے فکری تناظرات میں شاعرانہ تخیل اور شعری احساس جس نئی شعری روایت کا امین ہے وہ ادب، فن اور تخلیق کے مقامی و آفاقی، انفرادی و اجتماعی رجحانات کا پیش خیمہ ہے۔ جدیدیت پر دور میں اپنی ساخت کے اعتبار سے نئے ڈھنگ اور نئی وضع میں ڈھلی ہے۔ یہ نئی شکل ہر دور اور ہر زمانے کے عصری تقاضوں کا نتیجہ ہے۔اور جدیدیت کا مفہوم بھی اسی پس منظر میں بدلتا رہتا ہے۔ جدیدیت جس طرز احساس کی حامل ہے۔ وہ نئی شاعری کے خدوخال میں بھی ملتا ہے۔نئی شاعری کا شعری رویہ، جدیدیت کی فکری اساس ہے۔ بدلتی ہوئی اقدار اور ترجیحات کے اس دور میں نئی شاعری اپنے ادبی اور فنی پس منظر میں جدیدیت کے جو معیارات فراہم کرتی ہے۔اس بحث کو فضیل جعفری اس طرح سمیٹے ہیں۔

''نئی شاعری اور جدیدیت کے سلسلہ میں عام طور پر بحث کی جو سطح رہی ہے اور اس کی بنیاد بہت بڑی حد تک مفروضات پر رہی ہے۔عموماً ''میرے خیال میں''، ''میرے نزدیک۔۔۔۔۔'' اور ''میں سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔''قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں مگر سوال کسی کے خیال یا کسی کی مرضی کا نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ آج جو ایک نئے طرزِ احساس اور نئے انداز والی شاعری ہو رہی ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کا اظہار کس طرح ہو رہا ہے ۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ مشترکہ خصوصیات جنھیں ہم بحیثیت مجموعی ''جدیدیت'' سے تعبیر کر تے ہیں۔ ہر شاعر کے یہاں، اور ہر نظم یا ہر شعر میں ایک ہی انداز اور ایک ہی مقدار میں نہیں ملیں گے۔جس طرح عام زندگی میں کسی ایک واقعہ کا مختلف افراد پر مختلف قسم کا ردِعمل ہوتا ہے اور اگر اسی ایک واقعہ کے تعلق سے یہ مختلف لوگ اپنے ردِعمل کا اظاہر کریں، تو مرکزی واقعہ کے باوجود ہر شخص کے ردِعمل کی ایک الگ شناخت ہوگی، اسی طرح نئے شاعروں کے یہاں جدیدیت کے مختلف پہلو، احساسات کے مشترکہ دھاروں کے باوجود الگ الگ رنگوں اور الگ الگ

شکلوں میں ملتے ہیں۔کئی لوگ نئی شاعری اور جدیدیت کے سلسلہ میں گفتگو کر
تے ہوئے ساراز ورلفظیات میں تبدیلی اوراضافہ ترتیب نحوی،اوقاف،اعراب
اور ہئیت کے انوکھے پن پر صرف کر تے ہیں۔جدیدیت کے سلسلہ یہ تمام
چیزیں بھی بہت اہم ہیں مگران کی اہمیت مرکزی نہیں بلکہ ثانوی ہے۔ہرزمانے
کی جدیدیت اور ہرزمانے کی نئی شاعری دراصل عصریت سے عبارت ہوتی ہے
اورعصریت کاتعلق معاشرہ اورسماجی سے ہوتا ہے۔''[۹]

فضیل جعفری نے مذکورہ مضمون (نئی شاعری اورجدیدیت) میں نئی شاعری اور جدیدیت کے آپس میں فکری ارتباط اورتخلیقی روابط کو بڑے مدلل انداز میں ۔ بیان کیا ہے اور انہوں نے جدیدیت اورنئی شاعری کے موضوعات لسانی حوالوں لفظ کے استعمال اورحقیقی معانی تک رسائی کو نئے شاعروں (افتخارجالب،کمار پاشی،قاضی سلیم،شہریار، باقرمہدی،شمس الرحمٰن فاروقی،عمیق حنفی وغیرہ) کی مختلف شعری تخلیقات سے مثالوں کی مدد سے واضح کیا ہے۔

ہرعہد کی شاعری اس عہد کی فکری شناخت اوراس عید میں زندہ انسان کی پہچان کامعتبرحوالہ بھی ہوتی ہے۔شاعراس دور کے جدیدتر رجحانات کواپنا موضوع بناتے ہیں۔اس عہد کی شاعری میں انسان کی پہچان کےعلاوہ اس ماحول،گردونواح اور ثقافت، رسوم ورواج اور رہن سہن کی نمائندگی بھی ملتی ہے۔نئی شاعری کا مزاج فرد کی مکمل آزادی اورشعوری خودمختاری کی نشان دہی کرتا ہے۔اس کے بنیادی اوصاف میں ان کے باطنی وداخلی تصادمات اور نفسیاتی اندیشوں،غیرمطمئن ذہنی خلفشاراورناآسودہ خواہشات شامل ہیں۔

عابدحسن منٹونئی شاعری کے لئے مزاج اور نئے شعور کے تفہیم وادراک کے لیے نئے تنقیدی پیمانے وضع کرنے کے لیے نئے نقادکی ضرورت پرزوردیتے ہیں۔

''نئی نسل کا مسئلہ اس عہد سے جڑا ہوا ہے ۔ یہ عہد نئے مزاج اور نئی
sensibility کے اظہار کے لیے نئے پیمانے وضع کرنے کا مطالعہ کرتا ہے۔
جس طرح نئی نسل نئے پیمانوں اورنئی علامتوں کی تخلیق میں لگی ہوئی ہے۔اس
طرح اس عہد کے ناقد کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ جدید مسائل کے تقاضوں کوسمجھے
اورسنجیدگی سے ان کا حل تلاس کرے۔اگرنئی نسل خیال وجذبہ میں ناپختگی اور

سطحیت کا شکار ہے تو اس پر کڑی تنقید کی جائے اور اگر نئی زبان و بیان اور خیال وجذبے کے ارتقا کا باعث بن رہی ہے۔ تو اس جذبے اور زبان کو فروغ دیا جائے لیکن یہ کام سنجیدہ ناقدین ہی کر سکتے ہیں، بزدآزمانہیں!''[۱۰]

نئی شاعری اسلوب اور مواد کے اعتبار سے انسانی فکر اور ذہن سے مربوط ہے۔ یہ انسان کے سماجی تفادات سے تصادم کے نتیجے میں تشکیل پاتی ہے۔ اس کا فکری سلسلہ تنہائی، اجنبیت، بیگانگی، بدلا یعنیت، ذات کے کرب، بحران اور عدم تشخص تک لامحدود ہے۔ نیا شاعر، نظم کی تخلیق سے اس عہد کے تمام تر تضادات کو فکری اکائی کی صورت ترتیب دیتا ہے۔ اور اس نے نظم کی بنت میں جدید انسان کے ذہنی انتشار اور پھیلاؤ، ظلم کو نوحوں، خودغرضیوں سے نئے قاری کو نیا شعور عطا کیا ہے۔ نئے شاعروں نے اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نئے لسانی لہجے اور شاعر کے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر انسانی باطن میں جھانکنے کی نئی صورتوں کو اجاگر کیا ہے۔ جس کا مشاہدہ ذات کے خارجی حوالوں سے انفرادی حوالوں اور خارجی دنیا سے داخلی دنیا تک کیا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اسی تصادم پر یوں معترض ہیں کہ نیا شاعر اس تصادم کو بیان تو کرتا ہے مگر المیے کے تمام اسالیب (عظمت) اور رموز سے مکمل طور پر آشنا نہیں اور یہ المیہ نئے شاعر کی اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

''نئی شاعری، انفرادی مسائل سے زیادہ اس المناک صورتحال سے دست و گریباں ہونے کی سعی کرتی ہے جس نے ان مسائل کو جنم دیا ہے۔۔۔۔ذات کا غیر ذات سے ٹکراؤ اور نتیجے کے طور پر غیر ذات کی شکست۔ یہ نئی شاعری کا بنیادی مسئلہ ہے۔ نیا شاعر خود کو ایک عدیم المثال صورت حال میں پاتا ہے اور وہ صورت حال یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا ہر پہلو کسی نہ کسی تصادم میں گرفتار ہے اس تصادم میں ایک ایسی ناگزیر بے چارگی ہے جو شکست ذات کے حادثہ کو پوری طرح المیہ بھی نہیں بننے دیتی۔ المیہ کے لیے کشاکش، کشمکش اور جدوجہد کا عنصر لازمی ہے لیکن نئے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ وہ پوری طرح المیہ کی عظمت کو بھی نہیں پہنچ پاتا۔ وہ ایک دیوتا ہے لیکن تنہا، اس کا ایک مقدس مندر ہے، لیکن جل رہا ہے، وہ آواز دے رہا ہے کہ میرے پوجنے والے کہاں ہیں۔؟ لیکن کوئی جواب نہیں ملتا۔''[۱۱]

نئی شاعری کے علمبردار شاعروں کی تخلیقات میں جس نوع کی شاعری ملتی ہے وہ ہمارے فکری مسائل کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ یہ مسائل ایک سطح پر تو ہمارے ذہنوں میں موجود تھے لیکن اس کا منظّم اور مربوط اظہار ان لسانی نوادرات میں ملتا ہے۔نئی شاعری کی ایک اہم ترین نثری نظم ہے۔نثری نظم اظہار کا زیادہ وسیلہ رکھتی ہے۔ اپنے Content کے اعتبار سے اس میں خیال کی کئی صورتیں،اشکال اور تصویریں ملتی ہیں۔

نئی شاعری نے اپنے مخصوص لحن میں متنوع ہیتی رجحانات کے ساتھ ساتھ فنی منشور سے متشکل ہوکر نئے شعری تناظر کو جنم دیا ہے۔نئی شاعری پر مغرب کی جدید تحریکوں سمبلزم،اور امیجز م کا بھی خاصا اثر ہے۔اس بناء پر نثری نظم اپنے موضوع،حوالہ،انداز بیانِ،ہیت واسلوب کی متنوع تبدیلیوں کے باعث ترقی کی منازل طے کررہی ہے۔

افتخار جالب [۱۲] نئی شاعری کی تحریک کے بنیادی نظریہ ساز شاعر اور نقاد ہیں۔انہوں نے نئی نظم کے فروغ اور ارتقاء میں بھرپور کردار ادا کیا۔ان کی عہد ساز نظمیں اپنے تخلیقی مزاج،لسانی آہنگ اور انفرادیت کا مرقع ہیں۔اور ان کے ہاں اپنے عہد کا سیاسی،سماجی اور تاریخی شعور بھی بھرپور ہے۔

افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔روایتی اور کلاسیکی زبان کے بجائے زبان میں شکت و ریخت کو ترجیح دی ہے۔وٹگنسٹائن کے "Language game"جیمز جوائس کے ناولوں میں زبان سازی کے عمل،سوزن کےلینگر کے لسانی نظریات سے انہوں نے خوب استفادہ کیا اور اردو شعر وادب میں ان کی عملی صورتیں دکھائیں۔ان کی نظمیں،ان کے نظریات کی عملی شکلیں،ہیں۔لسانی تشکیلات کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''لسانی تشکیلات اساسی طور پر شعر وادب کی نیابت کرتی ہیں مواد کو اس ہیت میں دیکھنا ایک رائج الوقت معاونوں سے نجات ہی نہیں دلاتا بلکہ اس جوہر ناس کو بلاشرکت غیر ممیز کرتا ہے جس کی منظّم شکل وصورت کی پہچان از خود مسلک کی حیثیت رکھتی ہے۔'' [۱۳]

افتخار جالب کی نظموں کا لسانی لب ولہجہ،نئی لفظیات کو لسانی پس منظر میں سمو دیتا ہے۔جس سے معانی کے غیر مروجہ پہلو سامنے آتے ہیں۔اور نئی تراکیب بھی وضع ہوتی ہیں۔افتخار جالب کے شعری ویژن اور اسلوب میں جو لسانی شعور کارفرما ہے وہ نت نئے سانچوں اور مفاہیم کے وسیلے سے زبان کے تغیرات سے معمور ہے۔ یہ لسانی

آہنگ کسی بھی سطح پر اپنی معنویت نہیں کھوتا بلکہ زبان کے تجربات میں ان کی منفرد سوچ کا عملی صورت میں غماز ہے۔ وہ نئے لسانی لحن سے استفادہ کر کے زبان کے مختلف النوع زاویوں کی گرہیں کھولتے جاتے ہیں اس بنا پر ان کا اسلوب کہیں تردید، الجھاؤ یا بکھراؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کی نظمیں ''میں' سے ''تو'' کے تصادم وتضاد سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں کا محور زندگی کی عدم اطمینانی، گھٹن، حبسی، اور زندگی کے اسرار و رموز ہیں جب کہ بیشتر آخری نظموں ی جہت سیاسی ہے۔

تو میرا گماں
میں کہ بیکراں ہوں، میرا کہیں خاتمہ نہیں ہے میں آسمان ہوں
میں بے زبان ہوں، فقط تمنا کی بھول نکلی!

وہ واقعات، جذبات یا احساسات کو الفاظ سے بیان نہیں کرتے بلکہ وہ الفاظ سے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ وہ ہر نوع کے الفاظ سے شعریت کو پیدا کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اور نئے اسلوب کی تعمیر کرتے ہیں۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ اور صنعتی معاشرے میں غالب طبقات کی منافقت کا نوحہ یوں لکھا ہے۔

بازار کے بھاؤ کی خرابی میں حسیناؤں کی تقدیر بھی الٹی ہے
سرعام اٹھاتے ہیں
تمناؤں کی ان مول حقیقت کا حساب ایسا نہیں، کوئی بتا بھی نہ سکے
لوٹنے والے مزے کرتے رہیں، عزتیں برباد بھی ہوں، لفظ زباں پر نہ رہے
لطف کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے، کہنے کو سب کہتے ہیں: یہ ٹھیک نہیں! عصمتیں لٹنی
نہیں چاہیں: یہ ٹھیک نہیں: کہنے کو سب کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔
ٹھیک ہے! یہ ٹھیک نہیں' صاحبو! الزام نہیں عین حقیقت ہے:
یہ دن لوٹ کے'

افتخار جالب کی نظموں کے اس مختصر جائزے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے نئی تشکیل، نئے ادراک، نئے شعور اور جدلیاتی طرزِ احساس کو متعارف کروایا ہے۔

نئی شاعری کے دوسرے اہم نمائندہ شاعر جیلانی کامران [۱۴] ہیں۔ جیلانی کامران، جدید تنقید کا ایک معتبر نام ہیں۔ ان کی نظموں میں تازگی اور زندگی کی حدت سے معمور کیفیات کا عنصر نمایاں ہے۔ نئی نظم کے بارے میں ان

کا نقطہ نظر کچھ یوں ہے۔

''اصل میں جو مسئلہ نئی نظم کے شاعر کو درپیش ہے وہ فلسفیانی نوعیت کا ہے اور اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟ نئی نظم کا شاعر یہ نہیں پوچھتا ہے کہ دنیا کیا ہے؟ معاشرہ ایس کیوں ہے! کائنات کیا ہے؟ وہ صرف اپنی شناخت چاہتا ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ شاعر معاشرے، دنیا اور کائنات سے بے تعلق ہے۔ اور صرف اپنے آپ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ یوں نہیں کرسکتا کیوں کہ اس سے پہلے بہت سے شاعر اپنے آپ کو اپنا مواد بنا چکے ہیں۔ نئی نظم کا شاعر اپنا سوال میں کون ہوں؟ کسی خلا میں نہیں دہراتا۔ بلکہ اس کا سوال زمین پر اس معاشرے میں اسکی دنیا اور اس کائنات میں گونجتا ہے۔ اور جن نوع کا زمینی رشتہ اسے نصیب ہوا ہے۔ وہ اس میں اپنا مقام موجود اور کردار تلاش کرنا چاہتا ہے۔ لہذا جب وہ اس سوال کو کہ 'میں کون ہوں' دہراتا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرا اس زمینی نقشے کے ساتھ کیا رشتہ ہے اور اس نقشے میں مرا مقام کس جگہ اور کہاں ہے؟'' [۱۵]

جیلانی کامران کی نظموں میں استعارہ' علامت' اسطورہ اور تمثال کے پیکر' الفاظ اور معانی کے آہنگ سے غیر رسمی اور غیر معمولی تخلیقی کشف وا کرتے ہیں۔ انسان کے وجود کے کرب، جدلیاتی تہذیب کے ٹکراؤ، سماجی اور معاشی مسائل کی بازیافت ہوئی ہے۔ ان کے کرداروں کی روحانی دلچسپی اپنے قاری کو زندگی کے ایسے معنی خیز قرینوں سے آشنا کراتی ہے۔ جہاں عام انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ ان کی نظموں کا پس منظر، تہذیب کی بازیافت، روحانی اقدار کی نادری، اور مذہبی شعور ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی باطن سے بے حس طبقے کے ابتدا کو موضوع بنایا ہے۔ اور ان سب زوال آمیز اقدار کی بحالی کے لیے مزہب سے لگاؤ اور روحانی کشف کو ترجیح دی ہے۔ ''نقش کفِ پا'' ان کی ایک طویل نظم ہے جو ڈرامائی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کے کردار ہماری زندگیوں سے ماخوذ ہیں۔ نظم کے کرداروں میں ایک قیدی، ایک نوجوان، ایک عورت، ایک سایہ اور تخلیق کار ہیں۔ قیدی کا کردار اجنبیت اور Alienation کا شکار ہے۔ جب کہ اس کے گرداگرد اندھے افراد کا گھیراؤ ہے جو مسلسل رقص کر رہے ہیں۔ انسان اور انسانی اقدار سے بے خبر بھی ہیں۔ اس معاشرے میں سب کچھ موجود ہونے کے باوجود وہ اپنی بینائی کے کھونے کے باعث کچھ بھی دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ حزن، دکھ اور مایوسی ایسی کیفیات سے ماورا ہیں۔ ان کے نزدیک سب کچھ خوشی ہی خوشی ہے۔

اندھا فرد، قیدی سے یوں مخاطب ہے

موت کا ذکر کرکوئی ذکر ہے؟ جب تک ہم ہیں

موت موجود نہیں ہے! اس کا کس لیے تذکرہ اور ذکر کریں ان کے
نیک ایام کو منحوس کہیں؟
زندگی موت کی محراب میں کاٹیں، اپنے
سانس ہر وقت گنیں
موت کا ظلم سہیں!

''ابی نمر'' کے کردار کے ذریعے جیلانی کامران نے جدید شعری روایت میں اک نئی امنگ پیدا کی ہے۔ ''ابی نمر'' کا مرکزی کردار زندگی میں مصائب اور دکھوں کے باوجود زندگی بسر کرنے کی ایک امید رکھتا ہے۔ وہ اپنی مجبور ''فاطمہ'' کو یاد کرتا ہے۔ اور اپنے گیتوں میں اس کے حسن کی بے پناہ تعریف کرتا ہے۔ اسے اس سرزمین سے محبت صرف ''فاطمہ'' ی موجودگی کی بدولت ہے۔

وہ کہتا ہے:

آ وَاے دوستو! کہ سویرے کی روشنی
نعمت ہے اس کے جشن کا سب تذکرہ کریں
راتیں اگر طویل بھی ہوں دن ہے لازوال
آپس میں ہم نہ آج کیوں یہ ماجرا کہیں
گر زندگی نصیب نہ ہوتی تو فاطمہ
ہوتی کسے پسند

(ابی نمر)

عباس اطہر[۱۶] نئی شاعری کی تحریک کے ایک منفرد نظم گو شاعر ہیں۔ نئی شاعری میں جہاں سماجی تضادات سیکولری نظام اور تہذیبی تصادم کا اظہار ملتا ہے وہاں نیا شاعر اپنی جبلت اور جنسی لاچارگی کا اظہار بھی برملا کرتا ہے۔ عباس اطہر کے ہاں جبلت کا بیان اور تقاضے محض کسی نفسیاتی کشمکش یا ذہنی تشدد کا نتیجہ نہیں بلکہ انہیں اس جبلت سے جنم لینے والے حقائق کا اندیشہ لاحق ہے۔ عباس اطہر نے اس نفسیاتی اور شخص پیچیدگی کا ردعمل بڑے واضح انداز میں کیا ہے۔

حاملہ مٹی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
سر اور پیر تصادم میں ہیں

تاریکی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں
سر اور پیر تصادم میں
حق زوجیت ماتھے پر
بیل ہوں، پتھریلی کھیتی میں ہانپ گیا ہوں
ہل ٹیڑھا ہے
خصی بیلوں کی سب جوڑیاں
پتھریلے کھیتوں میں ہانپ چکی ہیں
بیج بکھیرنے کے آہن بھی بدل چکے ہیں
جائے پیدائش کا لمحہ کب آئے گا

(ہل ٹیڑھا ہے)

عباس اطہر کا موضوع سیاسی، سماجی اور روزمرہ کے دوسرے اہم اور غیر اہم مسائل بھی ہیں لیکن جنسی حوالے سے ان کا نقطۂ نظر محض جنسی جبلت یا جنسی ضرورت تک محدود نہیں بلکہ ایک تہذیبی رجحان کا عکاس ہے۔ جس کا اظہار تو ہر انسان چاہتا ہے مگر وہ معاشرتی جکڑ بندیوں میں ہے۔ عباس اطہر ان پابندیوں کے باعث بھی جنسی کیتھارسس کو بڑے واضح اور حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

انیس ناگی[۱۷] نئی شاعری کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کی معنوی ساخت، ان کے بطن سے جنم لینے والے کرب اور شدت ے احساس سے ہم وصل ہوتی ہے۔ انہوں نے نظم کے محدود کینوس پر ایک نفسیاتی گھٹن، مایوسی، بزدلی، احساس کمتری، فنی اور جمالیاتی ارتقاء، زندگی کے عدم توازن پن اور بے حسی کی بھرپور منظر کشی کی ہے۔ جس کا لب لباب انسان کے بے عملی اور بے حسی کے جواز کی تلاش ہے۔ وہ تیسری دنیا میں روا رکھے جانے والے ناروا ظلم کو احتجاج کی رو میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ترقی یافتہ ملک کے باشندوں کو احساس ندامت سے استعمار کے خلاف ابھارتے ہیں۔

اے مستقبل کے شہرو!
ہم تم کو اپنی امیدوں سے آباد کریں گے
ضعف اور ہم عصروں کی کم ہمتی سے گریزاں

رہیں گے
کہ ان کی بدولت یہ نادر خطے تیری
دنیا کے تاج پہنے ہوئے اپنی بجائے
دوسروں کے نگہبان ہیں۔

(نوحہ۔۴)

تبسم کاشمیری [۱۸] نئی شعری روایت کا ایک معتبر نام ہیں۔ ان کی نظمیں جدید نظم کو معتبر اعتبار بخشتی ہیں۔ جنہیں پڑھ کے ایک خاص نوعیت کی اداس فضا اور جدید حسیت کا گہرا تاثر ملتا ہے۔ ان کی نظمیں غیر معمولی فنی محاسن اور کرافٹ کا مرقع ہیں۔ ان کے ہاں علامتیں، استعارے، اور تمثالیں ایک دوسرے سے معانقہ کر کے لفظ کی کئی پرتیں پیش کرتی ہیں۔ جو نظم کو فنی اور معنوی حسن سے دوبالا کرتی ہیں۔

اس نے میری آنکھوں پر تتلیاں بوئیں
اور میں نے اس کے ہونٹوں پر گلاب چسپاں کر دیئے
اس نے میری انگلیوں پر اانگ گرائے
اور میں نے اس کے ماتھے پر بادبان سجا دیے
اس نے میرے بازوؤں پر پرندے اڑائے
اور میں نے اس کے سینے پر سمندر انڈیل دیے

(وہ اور میں)

عصری حسیت اور سماجی انتشار کو نئی شاعری کے مختلف شعرا نے مختلف سطحوں پر موضوع بنایا ہے لیکن تبسم کاشمیری نے اسے منفرد انداز میں برتا ہے۔ انہوں نے بوجھل اور اجنبی فضا کے بجائے نئے تخلیقی تحیر اور اسرار درموز کی دنیا بسائی ہے۔ ان کے ہاں امیجز کا ایک وسیع تناظر ملتا ہے جیسے بارش، ہوا، باد، دھوپ، لڑکی، تالاب، پرندے، سمندر، گیت، پھول، موسم، تنہائی، خواب اور سفر وغیرہ کی تمثالیں ہر سمت نئے تخلیقی اپچ کو پیش کرتی ہیں۔

نئی شعری روایت میں زاہد ڈار [۱۹] کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ زاہد ڈار کے ہاں خوف کا عنصر، جنسی مسائل، نچلے طبقے کی محرومیوں داخلی انتشار، اور نا آسودگی کی علامت ہے۔ انہوں نے عورت کے کردار کو خوب نبھایا ہے۔ عورت کے بارے میں ان کا جو تاثر ابھرا ہے وہ جنسی گھٹن سے لبریز ہے۔ اور محبت کو مایوسی کی شکل میں

معرض وجود میں لاتا ہے۔ان سب مجبوریوں اور مسائل کا حل ایک عورت کا قرب ہے۔جس سے کئی نفسیاتی گر ہیں اور پیچید گیاں دور کی جاسکتی ہیں۔مگرعورت کا قرب بھی ان کے لیےان سب خواہشات کی عدم تسکین کے باعث بنتا ہے۔

میرے خیال میں وہ عورت
دنیا کی لذیذ ترین عورت ہے
میں اس کے اندر غرق ہو جاؤں گا
وہ مجھے دور دور سے اپنا آپ دکھاتی ہے
میرے اندر بھوک اور پیاس کو بیدار کرتی ہے
وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی ہے
اور میں ایک دھتکارے ہوئے کتے کی طرح
اپنی تنہائی میں واپس آ جاتا ہوں
(عورت اور میں)

مزید لکھتے ہیں

ماں کی نفرت بھری آنکھوں سے کہیں دور چلا جاؤں میں
بے نیازی سے بھر دوں
باپ کے کانٹے چن کر
روح ناپاک کروں
گیت شہوت کے، ہوس کے سن کر
ذہن بے باک کروں
ایسے جیون کی ہے
حسرت اب تک۔۔۔۔۔

سلیم الرحمٰن [۲۰] کا تعلق بھی نئی شاعری سے ہے۔وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔وہ مصور اور شاعر بھی ہیں۔سلیم الرحمٰن کے ہاں ''شہر'' کی علامت اپنے تہذیبی پس منظر اور زوال کی صورت ملتی ہے۔وہ نئی تہذیب سے

آشنا تو ہیں لیکن شہر کے تمدنی مسائل انہیں شہری انا اور کرب سے دوچار کرتے ہیں۔

میں اس دوزخی شہر کی الجھنوں میں
گھروں سے نکلتے تمدن کے سب راستے بھول کر
ایک ایسی ڈگر پر چلا ہوں
کہ چلتے ہوئے اپنے سائے سے ننگا بدن ڈھانپنے کی
ضرورت نہیں ہے
کہ اس شہر کے سب ستر پوش لوگوں سے میری ملاقات ہے
(مہذب شہر میں ننگا مسافر)

خوشبو کے پیچھے ہی پیچھے
میں کس دیس میں آ نکلا ہوں
اک بوجھل سی تلاش کی مانند
آوازوں کے اس ساگر میں
ڈوب گیا ہوں

سلیم الرحمٰن نے اس نظم میں زندگی اور سماج سے اپنے رشتے اور رویے کا اظہار کیا ہے۔ یہ ان کا اپنے داخلی کرب، اضطراب، گھٹن، قنوطیت اور عدم اعتمادی، کا ردعمل ہے۔ یہ درد نا کی محض ان کی ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کی ذات سے وابستہ اس سماج تک محیط ہے۔ خوشبو کے اس تعاقب میں آوازوں کے ساگر میں ڈوبنا، زندگی اور وجود سے ماورا ہو کر اپنی ذات کی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے دوچار ہونا' ان کی شاعری کی نمائندہ صورتِ حال کا تجزیہ ہے۔

میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں
اور انکار کے رات دن سے گزرتا ہوں
میرے لیے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری
سچائیاں مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پر مٹتی ہوئی تختیاں ہیں
مجھے اجداد کی ہڈیوں میں زندہ ہونے کی خواہش نہیں ہے

(ایک کتبہ)

عبدلرشید [۲۱] ایک نظریہ ساز شاعر میں جنھوں نے سماجی کشمکش سے لے کر انسانی جبلت تک کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں مرکب تمثالیں، الفاظ وافکار کے اک نئے منطقے کو چھوتی ہیں۔ منفرد لفظیات کی حامل ان نظموں میں زندگی کی بوقلمونی اور تیرگی اپنے تخلیقی انہاک میں لفظوں کی صورت اپنے مفاہیم سے لامحدودیت، رمزیت، اور ایمائیت کو جنم دیتی ہے۔ ان کے شعری مزاج کی وابستگی لفظ ومعنی کے لطیف ترین امتزاج سے ہے۔ جو اپنے ابلاغ میں از خود کسی تخلیق سے کم تر نہیں۔ ان کی نظموں میں فکر اور تہہ داری اشاروں اور کنایوں کے سہارے موضوع کی رنگینی اور اسلوب کے تنوع کی عکاسی کرتے ہیں۔

برس اے ابرِ نیساں
مری سانسوں کی باڑوں میں
جسے غصے کی بے روشن شبیہ
پل بھر کو لرزے اور پھر پانی میں گھل جائے
کسی نے درد کی چادر ہوا کے رخ پہ کھولی ہے
سمندر پر عمودی جست لے کر
لمبی چونچوں کے پرندے گر رہے ہیں
آخری دن کی شباہت کی طرح
دلوں کے ٹھہرے پانی پر
زوالِ عمر کی گھڑیاں گزرتی ہیں

(برس اے ابرِ نیساں)

عبدالرشید کی نظموں کا موضوع وہ انسان ہے جو متضاد ومتصادم رویوں اور شہری پر گھٹن فضا سے دوچار ہے۔ انہوں نے مختلف شخصیات کے لئے بھی نظمیں اور نوحے لکھے ہیں جن میں مجید امجد، انور ادیب، افتخار جالب، عرش صدیقی، عابد عمیق، مسعود اشعر، فیاض تحسین، فرخ درانی، اور اصغر ندیم سید شامل ہیں۔ جن میں ان سے ذاتی تعلقات کی روداد بیان کی ہے اور ان تخلیقی شخصیات کا پرتو بھی پیش کیا ہے۔

سعادت سعید [۲۲] نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ۶۰ کی دہائی کے آخر میں کیا۔ ان کی نظموں میں لفظ ومعانی کی

معنویت، علامت، استعارہ، تمثال اور اسطورہ کے سہارے شعر کے ابلاغ اور حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ جس سے لفظ، معانی کی حیثیت کو قطعاً غیر واضح نہیں کرتے اور نہ ہی شعریت کی نفی کرتے ہیں۔

ذہن کے کینوس پہ چمکی برق
نقش اوراق پہ ہوا ادراک
نظم لکھتا ہوں اور سوچتا ہوں
بجھ چکی ہے دمکتے خواب کی جوت
یعنی تخلیق کے لیے شاید
شرطِ اول بنی ہے ذات کی موت
زندگی کو سپاٹ دیکھا ہے
آگہی سادہ، غیر پیچیدہ
اک جہنم ہے ایک جنت ہے
بندگی کے بھی دو یہی طبقے ہیں
ایک سرمایہ دار، ایک غریب
چیختے ہیں معاشرے کے دکھ
ان کا سرچشمہ جانتے ہیں سب
قصرِ انصاف میں ہما نہ رہا
خوفِ فریادِ بےنوا نہ رہا

(ذہن کے کینوس)

سعادت سعید کی نظموں کے لسانی پیکر میں موجود منفرد تراکیب پر عربی اور فارسی کا اثر غالب ہے جو طرزِ احساس کے تغیر سے جنم لیتا ہے۔ اور قاری کے لیے اک نیا افسانوی جہان رکھتا ہے۔ ان کی نظموں کا اسلوبیاتی حسن، نظموں کے معنوی پس منظر کو نمایاں کرتا ہے۔ انہوں نے نئی شاعری کے فروغ میں اپنا منفرد کردار ادا کیا ہے۔ جس بناء پر نئی شاعری اپنے مدارج کے ساتھ جدید نظم کی روایت میں اپنی منفرد شناخت قائم کر چکی ہے۔

نئی شاعری کے تسلسل میں چند مزید شعراء مراتب اختر، احمد ہمیش، مبارک احمد، آفتاب اقبال شمیم، فہیم جوزی

اور عذرا عباس بھی شامل ہیں۔ ان شعراء کا نئی نظم کی ترویج میں خاص حصہ ہے۔ اور بیشتر شعراء آج بھی نت نئے اضافے کر رہے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی رائے میں

''نئے شاعروں کے یہاں زندگی کو ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے سمجھنے اور برتنے کا جو رجحان سامنے آیا ہے وہی اس نسل کا اکتساب ہے۔ داخلیت اور خارجیت، مواد اور ہیت، ذات اور کائنات، غم جاناں اور غم دوراں، بڑے موضوعات اور چھوٹے موضوعات ان سب کی تقسیم اور انہیں علاحدہ علاحدہ سمجھ کر ایک کو رد اور دوسرے کو قبول کرنے یا اپنے اوپر مسلط کرنے کو نیا شاعر ایک غیر فطری عمل سمجھتا ہے۔ وہ خارجی دنیا اور داخلی دنیا کو الگ الگ کر کے دیکھنے کا قائل نہیں لکہ ان دونوں کے گہرے ربط کو سمجھنا چاہتا ہے وہ فرد اور سماج دونوں کو الگ تھلگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کا لازمہ قرار دیتا ہے۔'' [۲۳]

خلیل الرحمٰن اعظمی نے نئے شاعروں کے تخلیقی رجحان کو خارجی اور داخلی دنیا کا امتزاج قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس شاعر کی بنیاد انفرادی تجربے یا مشاہدے کو نہیں بلکہ اس فن کار کے اجتماعی وژن کو کہا ہے۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو نئے شاعروں نے فن اور فن کار کے درمیان نئے لسانی رشتوں کو رائج کیا ہے۔ جو شعری روایت سے انکار تو نہیں مگر انحراف کی صورت روایت کے تسلسل کو بحال رکھے ہوئے ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، اردو دنیا، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۔

۲۔ عقیل احمد صدیقی، جدیدیت اور جدید شعری جمالیات۔ جدید اردو نظم۔ نظریہ و عمل، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۶۔

۳۔ افتخار جالب، دیباچہ مآخذ (شعری مجموعہ) مکتبہ ادب لاہور، سن ندارد، ص ۳۱۔

۴۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار، مشمولہ، چہار سو، جلد ۱۶، شمارہ ستمبر، اکتوبر، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۔

۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، نئی شاعری، نیا میتھڈ۔مشمولہ، نئی شاعری۔ایک مطالعہ مرتب افتخار جالب، نئی مطبوعات، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۹۱۔

۶۔ شمیم حنفی، نئی روایت، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۱۲

۷۔ انیس ناگی، نئی شاعری کا لسانی پیرائیہ، مشمولہ ادب لطیف، لاہور سالنامہ، ۱۹۶۸ء۔

۸۔ بورخیس/نسیم شاہد، شاعری کی تفہیم کا مسئلہ، مشمولہ ماہی ادبیات، بین الاقوامی ادب نمبر 1، جلو، شمارہ ۳۵/ ۲۶، ۱۹۹۶ء۔ ص ۲۱۲

۹۔ فضیل جعفری، نئی شاعری اور جدیدیت، مشمولہ جدیدیت کا تنقیدی تناظر، مرتب، اشتیاق احمد، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۲۹۔

۱۰۔ عابد حسن منٹو، نئی شاعری کے مسائل، نقطۂ نظر، ملٹی میڈیا افیئر ز لاہور، (اشاعت دوم) ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۰۔

۱۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، نئی شاعری کے بنیادی علائم، ہماری زبان، دہلی، مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۳۔

۱۲۔ افتخار جالب (۲۰۰۳ء۔۱۹۳۶ء) جڑانوالہ میں پیدا ہوئے ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کیا۔ لاہور کمرشل بینک، انشورنس کمپنی دبئی، اور الائیڈ بینک کراچی سے وابستہ رہے، مندرجہ ذیل دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔

i۔ مآخذ (سن ندارد)

ii۔ یہی ہے میرا لحن (۲۰۰۴ء)

انہوں نے ۱۹۶۶ء میں نئی شاعری کی Assessment کے لیے ایک تنقیدی کتاب، ''نئی شاعری۔۔ایک تنقیدی مطالعہ'' مرتب کی جسے اردو ادب میں نئی شعری بوطیقا کی حیثیت حاصل ہے۔جس میں نئی شاعری کی حقیقت، جواز، امکانات، حمایت اور تردید میں متعدد مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب (تنقید+شاعری) بعنوان ''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر'' بھی ہے جو کہ ۲۰۰۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب میں ان کی ایک طویل نظم ''قدیم بنجر'' بھی شامل ہے۔

۱۳۔ افتخار جالب، لسانی تشکیلات، مشمولہ، سویرا، ۲۷، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۶۶۔

۱۴۔ جیلانی کامران (۲۰۰۳ء۔۱۹۲۶ء) ضلع پونچھ (کشمیر) میں پیدا ہوائے۔ ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے۔انگریزی کرنے کے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے انگریزی زبان و ادب میں ایم۔اے آنرز کیا۔ اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ انگریزی میں بطور لیکچرر تعینات ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کا نام Worlds Whose Who of Intellecturals میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۸۶ء

میں تمغہ امتیاز، اور ۲۰۰۱ء میں صدارتی تمغہ حسن کارکردگی ملا۔ ان کے شعری مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ استانزے۔ ۱۹۵۹ء۔

ii۔ نقش کف پا۔ ۱۹۶۱ء۔

iii۔ چھوٹی بڑی نظمیں ج۔ ۱۹۶۷ء

iv۔ باغ دنیا۔ ۱۹۸۷ء

v۔ جیلانی کامران کی نظمیں (کلیات) ۲۰۰۳ء

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:
جیلانی کامران۔ ایک مطالعہ از لطیف قریشی،
ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۴ء)

۱۵۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۔

۱۶۔ عباس اطہر، نئی نظم کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''دن چڑھے، دریا چڑھے'' ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کا شعری کلیات بعنوان ''آواز دے کے دیکھ لو'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا جس میں انکے تینوں شعری مجموعے، دن چڑھے، دریا چڑھے، کہا سہا، اور ذکر، شامل ہیں۔

۱۷۔ انیس ناگی، شاعر، نقاد، افسانہ وناول نگار ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

i۔ بشارت کی رات، ۱۹۶۶ء۔

ii۔ غیر ممنوعہ نظمیں، ۱۹۷۴ء

iii۔ نوحے، ۱۹۷۶ء

iv۔ زرد آسمان، ۱۹۷۹ء

v۔ روشنیاں، ۱۹۷۴ء

vi۔ بے خوابی کی نظمیں، ۱۹۸۷ء

vii۔ آگ ہی آگ، ۱۹۸۹ء

viii۔ ابھی کچھ اور، ۱۹۹۰ء

ix۔ بے خیالی میں، ۱۹۹۲ء

x۔ صداؤں کا جہاں، ۱۹۹۵ء

xi۔ بیابانی کا دن ۱۹۹۷ء

xii۔ درخت مرے وجود، ۱۹۹۷ء

xiii۔ بیگانگی کی نظمیں (کلیات) ۲۰۰۰ء

xiv۔ جنم۔ ایک آندھی ۲۰۰۷ء۔

۱۸۔ تبسم کاشمیری، شاعر، محقق، نقاد، مورخ، ناول نگار اور مترجم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۵ء تک اوساکا یونیورسٹی جاپان، میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ان کے شعری مجموعے درج ذیل ہیں۔

i۔ تمثال۔ ۱۹۷۵ء

ii۔ نوحے تخت لہور کے۔ ۱۹۸۵ء

iii۔ کاسنی بارش میں دھوپ۔ ۱۹۹۰ء

iv۔ بازگشتوں کے پل پر۔ ۱۹۹۳ء

v۔ پرندے، پھول، تالاب، ۱۹۹۶ء

۱۹۔ زاہد ڈار، نئی نظم کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ابتداء میں محمد حسن عسکری کے ادبی پرچے ''سات رنگ'' میں ''مادھو'' کے نام سے لکھتے رہے۔ ان کے دو شعری مجموعے

i۔ درد کا شہر۔ ۱۹۶۵ء

ii۔ محبت اور مایوسی کی نظمیں۔ ۱۹۸۲ء

میں شائع ہوئے۔

۲۰۔ سلیم الرحمٰن، پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ اچھے مصور ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی شاعر بھی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ شام کی دہلیز ۱۹۶۳ء

ii۔ منظر جاگتا سوتا (کلیات۔ جلد اول) ۲۰۰۷ء

۲۱۔ عبدالرشید، نئی نظم میں ایک نیا انگ رکھتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے یہ ہیں۔

i۔ انی کنت من الظالمین ۱۹۷۳ء

ii۔ اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں ۱۹۷۴ء

iii۔ پھٹا ہوا بادبان ۱۹۷۷ء

iv۔ خزاں اور میں ۱۹۸۷ء

v۔ صبح کا پہلا کبوتر ۱۹۹۰ء

vi۔ نیند،موت اور بارش کے لیے نظمیں۱۹۹۳ء

vii۔ انور ادیب کے لیے نظمیں۲۰۰۲ء

viii۔ بنکاک میں اجنبی ۲۰۰۵ء

ix۔ افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں ۲۰۰۷ء

۲۲۔ سعادت سعید،شاعر اور نقاد ہیں۔ان کے شعری مجموعے یہ ہیں۔

i۔ کجلی بن۔۱۹۸۸ء

ii۔ فنون آشوب۔۲۰۰۲ء

iii۔ بانسری چپ ہے۔۲۰۰۳ء

iv۔ شناخت ۲۰۰۷ء

۲۳۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، نئے شعری رجحانات،مضامین نو،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ، ص ۶۵